یہ کہانی اردو کے مشہور افسانہ نگار
مس مظفر پوری نے لکھی ہے

ایک شخص کی کہانی
جس کے مشاغل جدا، نشانہ سچا
اور دل شیشے کا بنا ہوا تھا

پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو کے بعد میں گھر جانے کے لیے سامان باندھ رہا تھا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے مجھے خبر دی کہ میرے نام کا فون ہے۔ مجھے کچھ حیرت سی ہوئی کیونکہ شہر میں میری جان پہچان کا کوئی نہ تھا۔ یوں بھی میں پہلی بار اس شہر میں گیا تھا اس لیے اجنبی ہی تھا۔ ایک منٹ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر لیں لیکن کوئی بات ذہن میں جمی نہیں۔ ایک شک یہ گزرا کہ شاید بھیجنے کسی ہم نام نے ہوٹل میں قیام کر رکھا ہو۔ میں نے بیرے سے پوچھا "ٹھیک پوچھ لیا ہے؟ میرا ہی فون ہے نا؟ میرا تو یہاں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔"

"منیجر صاحب نے آپ ہی کا نام اور کمرہ بتایا ہے۔ کمرہ نمبر گیارہ، عظمت حسین۔ یہی ہے نا آپ کا نام؟"

"نام تو یہی ہے۔ کہیں میرے نام کا کوئی اور آدمی تو یہاں ٹھیرا ہوا نہیں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم ہے صاحب! منیجر صاحب نے آپ کو بلانے کو کہا ہے۔"

"اچھا چلتا ہوں۔" میں بیرے کے ساتھ چل پڑا۔

Https://www.facebook.com/groups/372605677178945/

فون واقعی میرے نام تھا۔ انٹرویو بورڈ کے ایک سینئر رکن مراد علی خاں نے مجھے یاد کیا تھا۔ مراد علی خاں بہت وجیہہ اور متاثر کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ انٹرویو کے دوران میں وہ مجھے سر سے پاؤں تک بہت غور سے دیکھتے رہے تھے۔ میں محسوس کرتا رہا تھا کہ انھیں مجھ سے کچھ غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ سوالات انھوں نے مجھ سے ایسے بھی کیے جن کا انٹرویو سے کوئی خاص تعلق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ان باتوں سے میرے اقتصادی اور خاندانی پس منظر پر روشنی پڑتی تھی لیکن یہ سوالات انھوں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کیے تھے کہ بظاہر بے جوڑ معلوم نہیں ہوتے تھے۔ انھی سوالات میں گنجائش پیدا کر کے انھوں نے اس ہوٹل کا نام بھی پوچھ لیا تھا۔

فون پر انھوں نے بہت مختصر بات کی۔ صرف یہ بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے مجھے شام کی چائے اور رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہ غیر متوقع التفات مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا لیکن ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے دعوت منظور کر لی۔ کچھ یہ بات بھی ذہن کے کسی گوشے میں تھی کہ پبلک سروس کمیشن میں ان کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ معلوم نہیں، میری کون سی ادا انھیں پسند آ گئی تھی۔ ویسے میں اپنی ذہانت، صورت اور قد و قامت کے اعتبار سے اپنے اندر پہلی نظر والی اپیل رکھتا تھا۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی تک میں نے کتنی ہی لڑکیوں کو متاثر کیا تھا۔ اپنی خداداد دل کشی کی وجہ سے دوستوں اور شناساؤں میں بھی قابلِ رشک تھا۔ میرے ان اوصاف پر جس خوبی نے جلا کر رکھی تھی، وہ میری پارسائی تھی اور میری پارسائی کا سب سے مشہور ثبوت یہ ہے کہ ایک غیر معمولی لڑکی نے مجھ سے مایوس ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ بات خود ستائی کی ہے لیکن حقیقت ہے، کوئی مانے یا نہ مانے۔

لیکن مراد علی خاں صاحب کو میری ذاتی خوبیوں یا خرابیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میں سارا دن اسی ادھیڑ بن میں شام کا انتظار کرتا رہا۔ رہ رہ کے گھڑی پر نظر جاتی تھی۔

شام ہوئی اور میں مراد علی خاں صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ خاں صاحب کے طرزِ زندگی میں کروفر تو بہت تھا لیکن ان کا بنگلا اتنا پرسکون تھا کہ سونا سونا معلوم ہوتا تھا۔ دو تین شائستہ نوکر تھے۔ ان کی ادھیڑ لیکن خوب صورت اور تن درست بیگم تھیں اور وہ خود تھے۔ معلوم ہوا کہ لاولد ہیں۔ اس وقت میرے دل کے ایک دور دراز گوشے میں ایک شک ابھرا کہ کہیں وہ مجھے بیٹا نہ بنانا چاہتے ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک لڑکی کو انھوں نے متبنیٰ کیا بھی تو وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی گئی۔ ان کا ساتھ اسے راس نہیں آیا۔ اس بات پر میرا شک اور بڑھ گیا لیکن خاں صاحب یا ان کی بیگم نے اشارتاً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ میرے گھر، خاندان، مشاغل وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے باتیں کرتے رہے۔ میں نے بیچ بیچ میں کئی بار جاننا چاہا کہ وہ مجھ سے کیا کام کیا تھی جس کے لیے انھوں نے مجھے بلایا ہے لیکن وہ ہر بار ٹال گئے۔ کھانا دسترخوان پر آتے آتے ان میاں بیوی نے مجھے اتنا بے تکلف کر لیا تھا کہ باتوں باتوں میں اس لڑکی کا بھی ذکر آ گیا جس نے میرے غم میں خودکشی کر لی تھی۔

بیگم صاحبہ کا جی جیسے دھک سے رہ گیا اور وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں: "اس پر تمھیں فخر نہیں کرنا چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کبھی نہ کبھی وقت تم سے ضرور انتقام لے گا۔ یہ خودکشی نہیں تھی، قتل تھا۔ خدا نہ کرے کسی پر کچھ ایسی بن آئے کہ اسے خودکشی کرنی پڑے۔"

میں بیگم صاحبہ کی اس وارننگ پر سہم گیا اور اپنی صفائی پیش کی: "آپ غلط نہ سمجھیں۔ وہ محبت یک طرفہ تھی۔ لڑکی تو اچھی تھی ہی، ہو سکتا تھا کہ میں بھی اسے شادی کے لیے پسند کر لیتا لیکن اس لڑکی کے والدین نے پیغام بھیجنا اپنی عزت اور شان کے خلاف سمجھا کیونکہ یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ وہ لڑکی مجھ پر فریفتہ ہے اور میں اس سے دامن بچاتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا بھی سن گن ملتی کہ وہ خودکشی ہی کر لے گی تو میں اسے بچانے کی کوشش ضرور کرتا۔ اب مجھے بہت دکھ ہوا لیکن میں بے قصور ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے بحث کرنی چاہی تو خاں صاحب نے بات کاٹ کر کہا: "چھوڑو یہ بیکار بحث۔ اس لڑکی سے میرا کچھ رشتہ ہوتا تھا اس لیے بیگم صاحبہ اتنی دل چسپی لے رہی ہیں۔ ہمیں بھی دل ہی دل میں اس نوجوان کو دیکھنے کا اشتیاق تھا جس کی محبت میں اتنی ذہین اور حسین لڑکی نے خودکشی کر لی۔ سو آج اتفاق سے تم مل ہی گئے۔ تم اس کی خودکشی کا سبب ضرور ہو مگر ذمے دار نہیں ہو۔"

مجھے اب یہ ماحول بہت پُراسرار محسوس ہونے لگا۔ میرا دھیان کھانے کی طرف نہیں بلکہ خاں صاحب اور بیگم صاحبہ کے چہروں کی کیفیات کی طرف تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دیتے تھے۔ میں بہت الجھن محسوس کرنے لگا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح کھانا ختم کر کے بھاگ نکلوں۔

کھانے کے بعد مجھے دیر تک خاموش دیکھ کر خاں صاحب نے بات چھیڑی: "عظمت میاں! دراصل بات وات کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے تمھیں یوں ہی بلایا تھا۔ کل انٹرویو لیتے وقت میں نے تمھاری طرف ایک کشش محسوس کی۔ تمھاری صورت، تمھاری صحت، تمھاری ذہانت اور تمھارا اندازِ گفتگو، ان سب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ تم سے کیا چھپاؤں میرے دل میں ہمیشہ تمھارے ہی جیسے بیٹے کی آرزو پلتی رہی لیکن

نت کوئی کیا کرے میں اپنی یہ خواہش دبا نہ سکا کہ کچھ دیر تمھارے ساتھ مل کر اس حسرت پوری کرلوں۔"

میں تو خیر بہت نرم دل ہوں۔ کوئی سنگ دل بھی ہوتا تو خاں صاحب کی اس بات پر آب دیدہ ہو جاتا۔ ہم تینوں کئی منٹ تک خاموش بیٹھے باری باری ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس وقت مجھے کیا بولنا چاہیے یہ میری سمجھ میں نہ آسکا اور نہ اُن سے اجازت لینے کی ہمت پڑی۔

پھر خاں صاحب ہی نے بات شروع کی "ایک ہفتے بعد ہم ڈیڑھ ماہ کی چھٹی پر جا رہے ہیں۔ شام گڑھ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ تمھارے راج نگر سے اسی نوے میل ہو گا وہاں بیگم صاحبہ کا ٹیکا ہے۔ شریف اور سنجیدہ آدمیوں کے لیے چھٹیاں گزارنے کی اچھی جگہ ہے۔"

اب میں خاں صاحب کی باتیں دل چسپی اور ہمدردی کے ساتھ سُن رہا تھا۔ بجھا ہوا سگار پھر سلگا کر وہ کہنے لگے "شام گڑھ کوئی شہر یا صحت گاہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کے اِرد گرد میلوں میل چھوٹے چھوٹے جنگل اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ علاقہ غیر آباد نہیں ہے۔ دو دو تین تین میل پر چھوٹی بڑی انسانی بستیاں بھی ہیں جہاں تہاں جھیل اور جھرنے بھی ہیں۔ شام گڑھ کے قریب سے ایک گہری ندی بھی گزرتی ہے جس میں مچھلی کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ پرندے اور شکار کے چھوٹے موٹے جنگلی جانور بھی جہاں تہاں پائے جاتے ہیں۔ کھیتیاں بھی ہیں۔ بیگم صاحبہ کے ٹیکے کی حویلی کے اِرد گرد دور تک باغات بھی ہیں۔ مجھے تو وہاں بہت سکون ملتا ہے۔ زندگی کا سارا غبار دُھل جاتا ہے۔ شام گڑھ ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ جاگیر تو جاتی رہی پھر بھی اللہ کی مہربانی سے کچھ کمی نہیں ہے۔ خاندان سمٹ سمٹا کر مختصر ہو گیا ہے۔ ایک بھتیجا سرفراز خاں، ایک بھتیجی ماہ پیکر اور بوڑھی بھابی۔ دو چار نوکر چاکر۔ سرفراز خاں دل کا بادشاہ ہے مست اور موجی۔ رائفل کا یار ہے۔ ماہ پیکر علی گڑھ میں پڑھتی تھی لیکن ہاؤلے بھائی نے پڑھنا چھڑوا کر گھر بٹھا دیا ہے۔ بوڑھی فریدہ خانم ہیں تو وہ رات دن اپنا رحل مصلا سنبھالے رہتی ہیں۔" خاں صاحب کی اس غیر ضروری تفصیل میں مجھے بے لطفی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں شام گڑھ کی فضا اور حویلی کے تصور میں کھو سا گیا۔ خاں صاحب نے پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی لیکن کیوں؟ ـــ یہ انھوں نے بعد میں ظاہر کیا۔

"اگر وہاں کے ماحول میں چند دنوں کے لیے تم آسکو تو وہ تمھاری زندگی کے یادگار لمحے ہوں گے۔ ہماری دلچسپیاں بھی بڑھ جائیں گی۔"

خاں صاحب کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور کچھ اپنے اشتیاق کی وجہ سے بھی میں نے نیم رضامندی کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے مجھے شام گڑھ پہنچنے کا راستہ بھی سمجھا دیا اور تاکید سے کہا کہ اگر میں شام گڑھ کا قصد کروں تو انھیں خط ضرور لکھ دوں۔

اس کے بعد خاں صاحب سے اجازت لے کر میں چلا آیا۔ سارے راستے ہی نہیں، ساری رات طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ میں نے کتنے ہی مفروضات دل میں قائم کیے۔ یہ نہیں تو وہ، وہ نہیں تو یہ لیکن کوئی بات قطعی نہیں معلوم ہوئی۔ میں صرف اس نتیجے پر پہنچ سکا کہ ان ساری باتوں کے پس منظر میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔

خاں صاحب کی باتوں اور یادوں نے گھر تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا لیکن میں نے اس سرگزشت کا کسی سے ذکر نہیں کیا کیونکہ اس طرح پھر اُس لڑکی کا ذکر چھڑ جاتا جس کی خودکشی کا الزام مجھ پر عائد ہو چکا تھا اور دوست احباب مجھ پر سینکڑوں لعنتیں بھیج چکے تھے۔ وہ لڑکی ہی کچھ ایسی تھی لیکن میں بقول احباب ایسا بدنصیب نکلا کہ اُس کے خون کا دھبا دامن پر لگا بیٹھا۔ ناکردہ گناہ ہونے کے باوجود۔

میری طبیعت بچپن ہی سے کچھ معرکہ پسند واقع ہوئی ہے۔ میں نے شام گڑھ جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خاں صاحب کو اطلاعی خط نہیں لکھا۔ شاید میرے دل میں یہ آیا تھا کہ اچانک شام گڑھ پہنچ جانے سے ہو سکتا ہے، کسی ایسی بات کا سراغ لگ سکے جو خاں صاحب مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں کیونکہ دل میں ایک بے چین کر دینے والی کرید موجود تھی۔

صبح کی ٹرین سے چلا تو سہ پہر حضرت پور کے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے پندرہ میل تک بس کا سفر تھا۔ اس کے بعد تین میل تک پیدل چلنا یا اگر پہلے سے انتظام کر رکھا ہو تو کسی سواری سے لیکن میں اطلاع کے بغیر پہنچا تھا اس لیے پیدل ہی چلنا پڑا۔

سوٹ کیس اور بستر لے جانے کے لیے بمشکل ایک آدمی ملا۔

خاں صاحب نے شام گڑھ اور اُس کے گرد و نواح کی جو تصویر کھینچی تھی، وہ غلط نہیں تھی۔ بلکہ اصلیت کچھ سوا تھی۔ میں بہت دل چسپی سے ایک سیاح کی طرح سب کچھ دیکھتا گیا۔ منزل جوں جوں قریب آتی گئی، دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔

جس وقت گھنے باغوں کے درمیان سے حویلی کی جھلک ملی، ڈھلتے ہوئے آفتاب کا شعلہ بجھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی تاریکی اور لطیف خنکی کا احساس ہونے لگا تھا اور جب میں بلند و بالا اور پُرشکوہ حویلی کے صدر دروازے پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ذرا دیر کو میں ٹھٹکا تو فصیل کے بیرونی نکڑ سے ایک خوب صورت لمبا تڑنگا جوان کندھے سے رائفل لٹکائے میری طرف لپکا اور قریب آتے ہوئے بولا "آپ کون ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتا، وہ خود ہی کہنے لگا "آپ غالباً حسین معلوم ہوتے ہیں۔ خوش آمدید، خوش آمدید۔ آپ کا تو یہاں کب سے انتظار ہو رہا تھا لیکن میرے یار! اچانک ہی ٹپک پڑے۔ چلیے چلیے

https://www.facebook.com/groups/372605677178945/

اندر تشریف لے چلیے۔"

اس طرح مست اور متوالے سرفراز خاں نے میرا استقبال کیا۔ مراد علی خاں بھی بہت گرم جوشی سے ملے۔ اُن کی بیگم اور سرفراز کی والدہ فریدہ خانم نے تو جیسے میرے لیے آنکھیں بچھا دیں۔ جیسے میں اُن سب کا کوئی قریبی عزیز ہوں جو کسی دُور دراز مقام سے بھولے بھٹکے اُن کے درمیان پہنچ گیا ہو۔ میں اپنی اجنبیت کا احساس زیادہ دیر تک باقی نہ رکھ سکا۔

کچھ دیر گزرنے کے بعد جب نوکر نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو سرفراز خاں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "سرِ شام ہی کھا کے پڑ جائیں؟" پھر کمال بے تکلفی سے مجھ سے پوچھا۔ "شراب پیو گے؟"

پہلی ملاقات، سب کی موجودگی اور فریدہ خانم کی تسبیح و مصلا والی بات کا خیال۔ مجھے سرفراز خاں کی یہ بے تکلفی کچھ بھائی نہیں۔ البتہ یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اُس کے لیے چائے اور شراب ایک جیسی چیزیں ہیں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ "ابھی تک تو اللہ نے بچائے رکھا ہے۔" میں نے عذر پیش کیا۔

میری اس بات پر وہ ذرا تیکھا ہو کر کہنے لگا۔ "پھر کب پیو گے؟ بڑھاپے میں؟ اور یہ اللہ میاں کو بیچ میں کیوں لے آئے؟ شراب کا ذکر تھا، نماز کا نہیں۔" پھر وہ ذرا رُک کر بولا۔ "سمجھ گیا۔ تم صرف امی جان سے ملنے آئے ہو، مجھ سے نہیں۔"

مراد علی خاں صاحب کو بولنا پڑا۔ "بُرا ماننے کی بات نہیں ہے بیٹا! اپنا اپنا خیال اور اپنی اپنی طبیعت ہے۔ چلو، میں تمھارے ساتھ پیتا ہوں۔"

"ہاں چلیے۔" سرفراز خاں اُٹھ کھڑا ہوا۔

واقعی بڑا بھولا اور بگڑے دل آدمی ہے یہ۔ فریدہ خانم نے صفائی اور سفارش کے طور پر کہا۔ "بُرا نہ ماننا بیٹا! ذرا باؤلا ہے اور جب سے ایک واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا ہے، تب سے کچھ چڑچڑا بھی ہو گیا ہے ورنہ بڑا دلیر اور جی دار ہے۔"

میرے ہونٹوں پر صلح صفائی والی مسکراہٹ آتے ہی مطلع صاف ہو گیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی گپ شپ چل پڑی۔ حویلی کے کسی الگ تھلگ گوشے میں سرفراز خاں اور مراد خاں اپنا شغل کرتے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ مراد خاں کو شراب کا شوق نہیں ہے، بس کبھی اندھیرے اُجالے موقع پا کر چکھ لیا کرتے ہیں اور سرفراز خاں کے ساتھ تو آج پہلی بار محض اُس کا دل رکھنے کے لیے بیٹھ گئے ہیں۔

سفر کی تکان کی وجہ سے مجھے فوراً نیند آ جانی چاہیے تھی لیکن میں آدھی رات تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک سوال تو انٹرویو والی رات سے میرا ذہن پریشان کر رہا تھا لیکن آج دو سوال اور بھی ذہن میں کلبلانے لگے۔ سرفراز خاں کے ساتھ کون سا واقعہ پیش آیا تھا؟ اور وہ ماہ پیکر کہاں تھی؟ اُس کی جھلک تو انگ دہی، اُس کا ذکر تک نہیں آیا۔

صبح کافی دیر سے میری آنکھ کھلی۔ مجھے جو کمرہ دیا گیا تھا اُس میں آسائش و آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ کچھ آثار ایسے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھ سے پہلے یہ کمرہ..... معاً مجھے ماہ پیکر کا خیال آیا۔ ہاں یقیناً وہی..... میرا ذہن ابھی پوری بات سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ باہر برآمدے اور پردے کے درمیانی خلا سے دو پاؤں نظر آئے۔ سنہرے کام اور سبز مخمل کے سلیم شاہی جوتوں میں دو گورے گورے پاؤں اور گلابی چوڑی دار پاجامے میں کسی ہوئی گداز پنڈلیاں۔ میں نے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ یقیناً کوئی جوان عورت پردے کے پاس اندر کا رُخ کیے کھڑی تھی۔ ایک ہلکی سی کھانسی سے میں نے اپنے بیدار ہونے کا اعلان کیا۔ دوسرے ہی لمحے ہاتھوں میں چائے کی چھوٹی ٹرے سنبھالے، سبز ریشمی گھیر دار قمیص پر پیازی دوپٹا ڈالے ایک دہکتی ہوئی سُرخ و سفید سی لڑکی سرو قد میرے سامنے کھڑی تھی۔ بھیگے بھیگے کھلے ہوئے بال، کشادہ آنکھیں، صبح صبح کا نکھرا ہوا بے داغ حُسن، تازہ اور شاداب۔ چھلکاتے بند ہونٹوں میں بھنچی ہوئی اور لہر کے مانند جھل مل کرتی مسکراہٹ جیسے میرے سامنے عورت کے رُوپ میں ترشا ہوا ہیرا ہو۔ اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی خدا کتنا بڑا مصور اور کتنا بڑا بُت تراش ہے۔

مُردے کو زندہ کرنے والا یہ جادو دیکھ کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ انتقام! مراد علی خاں اور اُن کی بیگم کا انتقام۔ خودکشی کرنے والی لڑکی کے خون کا بدلہ! پوری سازش میری سمجھ میں آ گئی لیکن پہلی نظر کا وہ ایک ہی قاتل لمحہ فیصلہ کُن تھا اور میری حالت اُس بے بس مسافر جیسی تھی جس کے سامنے اچانک چنگھاڑتا ہوا سمندر آ گیا ہو اور واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہو۔

اُس مجسم قیامت نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر دل لُبھانے والے لہجے میں کہا۔ "میرا نام ماہ پیکر ہے۔ آپ نے سُنا ہو گا۔ کیا فضول سا نام ہے مگر میں اس سے بھی زیادہ فضول ہوں۔" اور ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولی۔ "آداب بجا لاتی ہوں!" اور پھر چائے اُنڈیلتے ہوئے اپنے آپ کہتی رہی۔ "کل میں بیمار تھی۔ کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ آج اُس کی تلافی کرنے آئی ہوں۔ کب سے آپ کے آنے کا سُن رہی تھی۔ پھوپی جان اور پھوپا صاحب نے تو تعریفوں کے پُل باندھ رکھے تھے۔" چائے میں چمچا چلاتے ہوئے اُس کا ہاتھ رُکا اور بہت معنی خیز لہجے میں بولی۔ "خدا جانے سچ کہ غلط۔"

میں نے چائے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "اگر آپ نے صحیح کہا تو یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گی۔" اُس نے مسکرا کر اپنی جھینپ چھپانے کی کوشش کی۔

میں چپ چاپ چائے پینے لگا۔ چائے کے فلیور اور ماہ پیکر کے

بھیگے بالوں کی ملی جلی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں چائے پیتا رہا اور بیگم مراد خاں کے الفاظ میری یادداشت میں گونجتے رہے۔ "کبھی نہ کبھی وقت خود انتقام لے گا۔"

اس کے بعد بھی ماہ پیکر سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن تنہا نہیں، سب کے سامنے اور اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی کا تصور ایسا ہونے لگا تھا جیسے مصور نے تصویر کا محض خاکہ کھینچ کر چھوڑ دیا ہو۔ لیکن میں اپنے اندر اتنی اخلاقی جرأت نہیں پاتا تھا کہ مراد خاں اور ان کی بیگم کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر سکوں۔ اعتراف کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ دونوں تو ماہ پیکر کے ذریعے شاید انتقام لینے کا پلان بنائے ہوئے تھے۔

دس بارہ دن ان لوگوں کی دلچسپ صحبتوں میں گزر گئے۔ میں جیسے اس خاندان کا رکن بن گیا تھا۔ سرفراز خاں تو مجھ سے کھنچا کھنچا رہتا تھا کیونکہ میں اس کا ہمذوق نہیں تھا لیکن مراد خاں صاحب کے ساتھ دور دور تک سیر سپاٹے کو نکل جایا کرتے۔ ہم کبھی مچھلی کا شکار کرتے اور کبھی چڑیوں کا۔ میں نے تو زندگی میں بندوق کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ مراد خاں ہی چھوٹے موٹے جانوروں پر ہاتھ صاف کیا کرتے۔

ایک دن میری طبیعت مراد خاں سے بور ہو گئی۔ میری اور ان کی عمروں میں جو فرق تھا وہ رنگ لایا۔ طبیعت کچھ سرفراز کی طرف رجوع ہوئی۔ آخر وہ ماہ پیکر کا بھائی تھا اور میرا ہم عمر بھی۔ پڑھا لکھا تو مجھ سے بہت کم تھا لیکن اس میں زندگی اور جوانی تھی۔ بس ایک عیب یہ تھا کہ شراب بہت پیتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کبھی کبھی دن کو بھی پی لیتا تھا۔

"میرے دل میں سرفراز کو دوست بنانے کی خواہش پیدا ہو گئی اور ایک دن دوپہر کو جب وہ نشے میں سرخ انگارا بنا ہاتھ میں رائفل لیے حویلی سے نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب اسے حویلی سے کچھ زیادہ دور جانا ہوتا تو بھری ہوئی رائفل لے کر نکلتا۔ خاصی دور تک میں اس کے پیچھے چلتا رہا لیکن وہ بے خبر تھا۔ آخر جب وہ ایک ٹیلے کے پاس رکا تو مجھے دیکھ کر حیرت سے چونک پڑا۔ "تم میرے پیچھے پیچھے کیسے آ گئے؟"

"یوں ہی۔ تمہاری کشش کھینچ لائی۔ تم تو پہلی ہی ملاقات سے کچھ ناراض ناراض سے نظر آتے ہو حالانکہ میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں۔ ایک شراب ہی تو نہیں پیتا۔ بس یہی نا؟"

وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر میرا منہ دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا: "کئی سال سے تنہا شراب پیتے پیتے تھک گیا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر سوچا تھا کہ چلو چند دنوں کے لیے ایک ساتھی ملا لیکن تم تو صوفی نکلے۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا: "اگر میرے شراب پینے میں تمہاری خوشی ہے تو پی لوں گا لیکن تم میرے دوست تو بن جاؤ۔"

"بن جاؤ گیا۔ میں تو تمہارا دوست ہوں ہی۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

پھر دل کھول کر باتیں ہونے لگیں۔ تب اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ سنایا کہ کس طرح اس علاقے کا ڈاکو سکندر ایک غریب کسان لڑکی کو اغوا کرنے کے لیے جا رہا تھا اور کس طرح اس نے لڑکی کو بچایا۔ پھر وہ لڑکی اس پر مرنے لگی اور وہ خود بھی اس کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول میں دلچسپی محسوس کرنے لگا مگر ان دونوں کے درمیان بہت سی باتیں مانع تھیں۔ سکندر کی نظر بد سے بچانے کے لیے سرفراز نے اس لڑکی کی شادی ایک جگہ طے کر دی مگر ٹھیک شادی کی رات..... جب وہ دلہن بن کر رخصت ہو رہی تھی، سکندر نے اسے پھر اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن سکندر نے بھاگتے ہوئے اتفاقاً اس لڑکی کو گولی مار دی۔ سرفراز نے پہلی بار اسی غم میں شراب پی تھی جسے چار سال گزر چکے تھے لیکن سکندر اسی وقت سے اس کا دشمن بنا پھرتا تھا۔ ماہ پیکر علی گڑھ میں پڑھ رہی تھی تو طرح طرح کے وسوسے سرفراز کے دل میں گھر کیے رہتے اور وہ تھوڑے تھوڑے دنوں میں اسے دیکھنے جاتا اور ایک بار وہ بہن کو ساتھ ہی لے آیا لیکن کچھ دنوں سے یہاں بھی ایک خطرے کی آہٹ محسوس ہونے لگی تھی اس لیے وہ ماہ پیکر کی شادی جلد از جلد کر دینے کے لیے پریشان تھا جس کے لیے اس چھوٹے سے خاندان کو ایک شایان شان لڑکے کی فوراً تلاش تھی۔ یہ کام سرفراز کے بس کا تو تھا نہیں اس لیے مراد علی خاں اور ان کی بیگم پر یہ ذمے داری ڈال گئی تھی۔

یہاں تک بتا کر وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر میری آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا اور بولا: "شاید اب تمہاری سمجھ میں یہ بھی آگیا ہوگا کہ تمہیں پُراسرار طور پر یہاں کیوں بلایا ہے؟"

ایک پل میں سارے پرزے اٹھ گئے اور میرے ذہن پر شکوک کی جو دھند لاہٹ تھی، وہ ختم ہوگئی۔ میرے اندر ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ میں سرفراز کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا: "ہم سب تمہیں پسند کر چکے ہیں ماہ پیکر بھی۔"

میرے تو دل کے کنول کھل گئے اور آنکھوں میں ہزاروں بہاریں ناچ اٹھیں۔ جی چاہا، سرفراز خاں کا سر چوم لوں۔ قسمت نے دنیا ہی میں مجھ پر بہشت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ سرفراز خاں نے پھر بہت فکرمند لہجے میں کہا: "مجھے ایک ایسے خطرے کی آہٹ ملی ہے کہ کل کی ہوتی بات کو چاہتا ہوں، آج ہو جائے۔ اگر تم....."

ابھی بات ادھوری ہی تھی کہ گولی کی آواز پر سرفراز چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی بوکھلا گیا۔ آواز حویلی کی طرف سے آئی تھی۔ سرفراز کی زبان سے بے ساختہ نکلا: "ارے! یہ فائرنگ کی آواز کیسی؟" ابھی اس نے ذہن پر زور دیا ہی تھا کہ پھر دوسری آواز آئی اور ہم دونوں گرتے پڑتے حویلی کی طرف دوڑ پڑے۔

حویلی کا ایک نوکر ہماری طرف بھاگتا نظر آیا تو ہم نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ رائفل کے بوجھ سے سرفراز کو دوڑنے میں خاصی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ جب ہم نوکر کے قریب پہنچ گئے تو وہ ہانپتے ہوئے جلدی جلدی کہنے لگا: "سرکار! غضب ہوگیا۔ سکندر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ چھوٹی بی بی کو باغ سے اٹھا لے بھاگا ہے۔ چھوٹی بی بی کی چیخ سن کر ہم سب دوڑ پڑے۔ بڑے صاحب اپنی رائفل کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکل پڑے ہیں۔ سکندر نے باغ کے رکھوالے کو گولی مار دی ہے۔"

ہم نوکر کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دور جانے پر پھر فائرنگ کی دو تین آوازیں آئیں اور ہم آواز کی نشان دہی کی سمت میں بھاگے۔ ہم اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ ایک بلند نسوانی چیخ سنائی پڑی۔ یہ چیخ یقیناً ماہ پیکر کی تھی۔ اس چیخ کی طرف ہم بے تحاشا لپکے جا رہے تھے۔ اللہ نصیب فراز خاطر میں لائے بغیر۔

آخر ہم نے سکندر کو جا لیا۔ ڈھائی تین سو گز کے فاصلے پر پہاڑی کی اوٹ سے پانچ چھ مسلح آدمی ماہ پیکر کو بندھے ہوئے ہاتھوں سے گھسیٹ کر لیے جا رہے تھے۔ ماہ پیکر کا پیرہن تار تار تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے سخت مزاحمت کی ہوگی۔ جبھی ان بدمعاشوں نے اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ سرفراز نے پوری طاقت سے للکارتے ہوئے پوزیشن لی اور فائرنگ شروع کر دی۔ اس کی پہلی ہی گولی سے ایک آدمی ڈھیر ہوگیا۔ سکندر کے اشارے پر دوسرا آدمی ماہ پیکر کو گھسیٹتا ہوا فرار ہونے لگا تو سرفراز نے اسے بھی داغ دیا۔ ماہ پیکر نے بھاگنے کی کوشش کی تو تیسرے آدمی نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اسی کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ سرفراز خاں تنہا تھا۔ اس کے ساتھ کارتوس کی پیٹی بھی نہیں تھی۔ بس رائفل میں جو گولیاں تھیں، انہی پر دارومدار تھا لیکن بدمعاشوں کی طرف سے دو آدمی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

میں دہشت زدہ ہو کر ایک چٹان کی اوٹ میں دبکا ہوا سارا ماجرا بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ مراد خاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ زخمی ہو کر راستے میں کہیں گر گئے تھے لیکن اس وقت تو مجھے یہ خیال بھی گزرا تھا کہ کہیں مر ہی نہ جا چکے ہوں۔

کارتوسوں کی کمی کی وجہ سے سرفراز سنبھل سنبھل کے اور نشانہ جما کر فائرنگ کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سے تڑاتڑ گولیاں آ رہی تھیں۔ آخر ایک گولی سرفراز کے کندھے کے پیچھے ہنسلی کی ہڈی میں آ لگی اور وہ تڑپ کر نڈھال ہوگیا۔ گولی بھرپور اور گہری لگی تھی۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سرفراز کے رائفل کی گولیاں بھی شاید ختم ہو چکی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ بے دم ہو چکا تھا پھر بھی رائفل سے اس کی گرفت چھوٹی نہیں تھی۔ بازو ڈھیلا ہوگیا تھا۔ زخم سے خون بری طرح ابلنے لگا تھا۔ درد اور اذیت کی شدت سے اس کے چہرے پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں بھی وہ سنبھالا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہنے کے بعد سکندر سمجھا کہ مطلع صاف ہو چکا ہے۔

سکندر نشانہ باندھے کچھ دیر اور انتظار کرتا رہا۔ پھر شاید اسے یقین ہوگیا کہ دشمن ہلاک یا زخمی ہو چکا ہے۔ اس سکوت پر ماہ پیکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی: "بھیا! ارے بھائی جان!" کی دل دوز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ سکندر نے جب اپنا اطمینان کر لیا تو ماہ پیکر کی طرف بڑھا جس کی آڑ لے کر اس کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

سرفراز کراہتی ہوئی آواز میں بولا: "عظمت میاں! ابھی رائفل میں ایک گولی باقی ہے جو خان بختیار کے گھرانے کی آبرو بچا سکتی ہے۔ تم ذرا میرے زخمی کندھے کو سہارا دو۔"

میں نے جیسے تیسے اسے سہارا دیا۔ نہ جانے کون سی طاقت سرفراز کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی توانائی مجتمع کر کے نشانہ باندھا اور تھرتھراتے ہاتھوں سے گولی چلا دی۔ ایک جگر خراش چیخ کے ساتھ ماہ پیکر زمین پر تڑپنے لگی۔ سرفراز کا سر بے جان ہو کر ڈھلک گیا۔

بر محل کی بات ہے مگر میں آج بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ سرفراز نے نشانہ ماہ پیکر پر نہیں بلکہ سکندر پر باندھا تھا۔

Zegham imran